ابوالفیض سحر

مظہر امام کے تنقیدی بیانات پر ایک بیان

''ایک لہر آتی ہوئی'' کے حوالے سے

مظہر امام عصری اُردو ادب کا ایک اہم اور معتبر نام اور تخلیقیت کا باوقار عنوان ہیں۔ یہ ہمارے عہد کے نامور شاعر و ادیب ہی نہیں بلکہ ایک آبرومند کثیر المطالعہ ادب شناس، فکر و خیال کے رمز آشنا پارکھ اور فن پاروں کے باریک بین ناقد بھی ہیں، جن کی نظر میں نئے ادب اور عصری حسیت کے پورے سیاق وسباق، منظر اور پس منظر بھی ہیں اور تخلیقی روکی رفتار و روش اور جہات بھی۔ مظہر امام، بطور خاص، گزشتہ نصف صدی کے نئے ادبی رویوں اور نئے رجحانات کے مدار و مرکز اور مزاج و کردار، بھی سے پوری طرح بہرہ مند ہیں، ساتھ ہی تخلیقی سفر کے نشیب و فراز سے بھی پوری طرح جڑے ہوئے ہیں۔ آزاد غزل کے ہیئتی تجربے کے سلسلے میں محرک و بانی کی حیثیت سے اور اس تعلق سے دوسرے سلسلوں میں بھی یہ بہت زیر بحث آتے رہے ہیں۔ مگر یہ بات طے ہے کہ اُردو ادب، نثر و نظم دونوں کے ارتقا اور ارتفاع کے فنی، فکری اور تہذیبی تناظرات میں انھوں نے خود کو بھی بحیثیت فنکار پرکھا اور جانچا ہے۔ اسی کے دوش بدوش، معاصر ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو ٹٹولا، ان کی متاع فکر و فن کے بھی پہلوؤں کا گہرا مطالعہ اور ماہرانہ تجزیہ بھی کیا ہے۔ ہماری وراثت، ہمارے کلاسیکی ادبی سرمائے سے رشتے، اس کے علاوہ ہیں۔ پھر فکر و فن کی نئی زمینوں اور نئے آسمانوں کی فکر اور تلاش و جستجو نے انھیں شعری جمالیات کی رمز آشنائیوں کے علاوہ ایک تنقیدی مزاج بھی بخشا ہے جو مہذب، محتاط اور شائستہ ہے مگر حسب تقاضۂ انصاف، بے باک اور بلند آہنگ بھی ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ بات ایک خاص وصف اور ظرف کی ہے۔ فکر و شعور کی یہی تحسین شناس جامعیت ہے جس کی وجہ سے مظہر امام ہمارے بلند مرتبت دانشوروں کی صف میں جگہ پانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

''ایک لہر آتی ہوئی'' میرے خیال میں ایک خاص ادبی ارتعاش یا تحرک (Literary vibration) کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔ ہر چند کہ یہ مظہر امام کے تنقیدی نوعیت کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے مگر دھوپ کا وہ دریچہ بھی ہے جس سے ان کی علمی، ادبی اقدار سے مخصوص قدر شناسی اور معیار بندی کے معیار و مزاج اور رویہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس میں مختلف اوقات اور مختلف موضوعات پر قلم بند کیے گئے مضامین و مقالات شامل ہیں۔ معروضی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں مباحث کا تنوع بھی ہے اور تحریر کی معنی آفریں شگفتگی بھی۔ پھر مظہر امام کے اندازِ بیان و پیرایہ

اظہار نے اسے خلقی طور پر جامع اور دلچسپ تو بنایا ہے ہی، ساتھ ہی اس کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ کیا ہے۔

اس مجموعے میں دو مضامین ''بہار میں اُردو افسانہ ۳۶ء کے آس پاس'' اور ''مغربی بنگال میں اُردو شاعری آزادی کے بعد'' بھی شامل ہیں جو نفسِ مضمون کے لحاظ سے علاقائی احاطہ رکھتے ہیں۔ مگر مظہر امام نے ان موضوعات سے بھی انصاف کیا ہے۔ اس سلسلے کے ایک ذیلی تاثر کی صورت میں مظہر امام اپنے اس احساس میں حق بجانب ہیں کہ ہمارے جید ناقدین محدود علاقائی موضوعات پر وقت ضائع نہیں کرتے۔ دیگر موضوعات بھی اہم ہیں مگر ''اقبال تیسری دنیا کے لیے'' اور ''غالب بے رنگ'' اپنے Scope اور Thought Content کے ساتھ نئے سوالوں اور نئی خیال افروزیوں کے اعتبار سے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن میں صرف تنقیدی مباحث سے ہی گفتگو کرتے ہوئے خود کو اسی دائرے تک محدود رکھنا چاہوں گا۔

''آج کا ادیب کتنا ادیب'' میں ایک وسیع تناظر میں مظہر امام نے ادب اور ادیب کے وصفی و خلقی رشتوں کی بات کرتے ہوئے ان مسائل کو بھی چھیڑا ہے جو عصری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

> ''میری نسل کے لوگ گزشتہ چالیس سال سے دیکھ رہے ہیں کہ ہماری تہذیب کی حسین قدروں کا حسن مشتبہ ہو گیا ہے۔ انسان اپنی عظمت کھوتا جا رہا ہے اور تباہی و بربادی کی طاقتیں سرافراز ہو رہی ہیں۔ نیکی، حق پسندی اور انسان دوستی کے نعروں میں پہلی سی حرارت نہیں رہی۔ قومی اور بین الاقوامی انتشار نے ایقان و اعتماد کی دیواروں کو متزلزل کر دیا ہے۔ زندگی کی عزیز قدریں فنا ہو چکی ہیں۔ تنگ نظری، جانب داری اور خود غرضی کی بڑی کریہہ صورتیں سامنے ہیں۔ نئی نسل نے تو اسی ماحول اور اسی فضا میں آنکھیں کھولی ہیں''۔

مظہر امام نے نئے ماحول اور نئے سماج میں آدرشوں اور اقدار کے تصادم، ارزانی اور ابتذال کی جو تصویر کھینچی ہے وہ ایک حساس اور باشعور ادیب اور فنکار کے احساسات و جذبات کی ترجمان ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے عصر حاضر کی ان ستم سامانیوں کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے ادیبوں اور دانشوروں کو بجا طور پر غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ ایسے مسائل پر، جو عصری زندگی پر گہرے اثرات مرتسم کر رہے ہوں، بے خوف ہو کر بے جھجک اپنے فنکارانہ ردِ عمل کا اظہار کریں۔ میرے خیال میں یہ ادیبوں اور دانشوروں کے مقصدِ حیات اور وظیفۂ حیات کا ہی ایک حصہ ہے جسے موجودہ عہد کے فنکاروں نے تن آسانی اور سہل انگاری، کہیں کہیں موقع پرستی اور کبھی کبھی مصلحت اندیشی کا شکار ہو کر شعوری طور پر طاق پر اٹھا رکھا ہے۔ افلاطون نے اپنے عہد کے ان تن آسان اور سہل نگار ادیبوں اور شاعروں کو جو صرف خیالی جنتوں اور احساس کے Ivory Tower میں ماحول سے بے نیاز و بے فکر اپنے آپ میں مگن رہا کرتے تھے، پھولوں کا تاج پہنا کر شہر بدر کرنے کی بات کہی تھی۔ آج بھی اگر ہمارے سماج میں ادیب و دانشور اپنی ذمہ داریوں

کومحسوس کیے بغیر، اسی رویّے سے محض نظریاتی سطح کے تفکر کو ہی بہت کچھ سمجھتے ہوں اور عملی زندگی سے فرار کا رویہ اختیار کرتے ہوں تو ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جانا چاہیے۔ زندگی میں، خاص کر ایک مہذب باشعور معاشرے میں، خیال و فکر کا عمل سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ اگر عمل نہیں تو خیال و فکر کی بھی کوئی قدر نہیں۔ مشقِ سخن کے ساتھ چکی کی مشقت بھی ادب اور زندگی کا مقصود ہے۔ نامساعد حالات سے یا کسی ناموافق صورتِ حال سے گھبرا کر یا مایوس ہو کر بیٹھ جانا کفر سے کم نہیں۔

فراریت (Escapism) کا رویہ کسی بھی فرد یا جماعت کے لیے خواہ وہ اسے عارضی طور پر اپنی ذات کے لیے کتنا ہی راحت افزا کیوں نہ محسوس کرے، غیر محسوس طریقے پر اس کے لیے فنا اور نابودیت کی طرف لے جانے والا ہے۔ اس لیے زندگی اور درسِ عمل کے مفکر شاعر اقبال نے کہا :

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

''فیض کی تنقیدیں'' کے عنوان سے مظہر امام نے انتقادِ ادب سے متعلق مختلف نکات و مسائل سے دلچسپ بحث کی ہے۔ اس دوران ایک اہم سوال بھی اُٹھایا ہے :

> ''سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی شاعری جو اپنے طرزِ احساس، فکری عوامل اور لفظیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور متغائر ہے اُسے پرکھنے کے پیمانے کیا ہوں گے۔ کیا میرؔ کو پرکھنے کے لیے مختلف پیمانۂ تنقید ہوگا اور غالبؔ کو پرکھنے کے لیے مختلف۔ کیا ہر دَور کے تنقیدی اصول مختلف ہوتے ہیں؟ اس مسئلے پر بحث ہو سکتی ہے۔ اگر شعر یا نظم ایک قائم بالذات خود کفیل اکائی ہے اور شعر کی باطنی اور نادیدہ کائنات کے سیاحت لسانی تجزیے سے ہی ممکن ہے جیسا کہ ''ہیئتی تنقید'' یا ''نئی تنقید'' ہمیں بتاتی ہے تو پھر تنقیدی اصول زمانے اور وقت کے ساتھ نہیں بدل سکتے۔ ترقی پسند نظریۂ تنقید اس موقف کو قبول نہیں کرتا۔ اس لیے فیضؔ اس نقطۂ نگاہ کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ تنقیدی اصول اپنے دَور کے مخصوص معاشی، سیاسی اور سماجی مزاج کو سامنے رکھ کر متعین کیے جاتے ہیں''۔

سوال اپنی جگہ بہت اہم ہے مگر لگتا ہے مظہر امام خود دامن بچا گئے۔ کوئی حقیقی اور سچا فنکار اپنے فن اور فکر سے خود کو بہت دیر تک علیحدہ نہیں رکھ سکتا۔ مظہر امام کے نقاطِ نظر کو بھی ان کے بیانات اور تحریروں میں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ ویسے تو اس سوال کا جواب بھی جدیدیت اور ترقی پسندی کے زیرِ بحث اعلانیوں اور عہد ناموں سے علاحدہ نہیں ہے۔ جہاں وقت نے دونوں طرف کی شدت پسندیوں، بے اعتدالیوں اور غیر فطری اندازِ فکر و اظہار اور ان کے نام نہاد ٹھیکیداروں کو مسترد

کر دیا ہے وہیں یہ بات بھی واضح کی ہے کہ زندگی ادب سے اور ادب زندگی سے اساسی طور پر مربوط اور منسلک ہے۔ کچھ رجحانات اور رویّوں کی بنیاد تبدیل پذیر حالات اور ان کے تقاضوں پر بھی قائم ہو سکتی ہے۔ بعض مفروضے اور اعتقادات بھی زندگی کی دیرپا اور دائمی حقیقتوں اور سچائیوں سے مل کر آفاقی قدریں بن جاتے ہیں۔ اس کا اطلاق زندگی پر ہوتا ہے اور اگر اس کا اطلاق زندگی پر ہوتا ہو تو اسی کلیے کے مطابق اس کا اطلاق ادب پر بھی ہوتا ہے۔ ویسے ہمارے نئے تنقید نگاروں نے انتقادیات کے دائرے میں خاصی گڑ بڑ کی ہے اور کئی زاویے نکالے ہیں اور کئی اُلجھاؤ بھی پیدا کیے ہیں۔ تارِ عنکبوت جیسی باتوں کو بھی دبیز بنانے کی سعی کی ہے۔ غیر ضروری طور پر طرح طرح کے تنقیدی اصول اور طریقۂ کار وضع کیے ہیں۔ ہر وضع یا موضوعِ بحث یا تجزیے کو ایک علیحدہ نام دے کر نئی نئی شاخیں بھی قائم کرنے کی کوشش کی ہے جس سے خود تنقید کی اہمیت، ضرورت اور افادیت معرضِ بحث میں آ گئی ہے۔ حالانکہ یہ ساری موشگافیاں فن پاروں کی جزئیات کے تجزیے یا جائزے ہی ہیں۔ انھیں علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھیں تو یہ الگ نظر آتی ہیں اور اگر جوڑ کر دیکھیں تو ایک ہی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ سلسلہ بڑی حد تک ایسا ہی ہے جیسے بچوں کے بعض کھلونوں کو، بعض خاکوں کو اور بعض ڈیزائنوں کو مختلف حصوں/ٹکڑوں میں بانٹ کر ان کو الگ کر کے بکھیر دیا جاتا ہے، پھر ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ دیں تو وہ کھلونا، وہ خاکہ اور وہ ڈیزائن اپنی اصلی صورت میں یکجائی کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح اصل تنقید تو سائنٹفک اور معروضی تنقید ہی ہوتی ہے۔ اگر اسے جمالیات سے جوڑیں تو وہ جمالیاتی تنقید کہلاتی ہے۔ تاثرات پر مبنی تنقید کو تاثراتی تنقید کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر اس کو متن سے ہی جوڑ کر دیکھیں تو یہ متنی تنقید ہو جاتی ہے۔ ہیئت اور ہیئت کے مسائل کو زیرِ بحث لائیں تو یہ ہیئتی تنقید بن جاتی ہے، پھر اسی طرح ساختیاتی تنقید وغیرہ وغیرہ۔ مگر غیر ضروری نکتہ سنجیوں کی کوششوں اور ادعائیت سے بچ کر اس طرح کی تقسیم و تخصیص کے عمل کو مربوط انداز میں پیش کر سکیں تو اُلجھاؤ، انتشار اور افراتفری بھی کم ہو سکتی ہے اور پراگندگی اور گمراہی کے امکانات بھی کم سے کم ہوں گے۔ یہ ادب کی ہی نہیں خود انتقادیات کی بھی بڑی خدمت ہوگی۔ مظہر امام کو بھی میں اس خیال کے قریب پاتا ہوں۔ تنقیدی عمل میں ان کا Approach براہِ راست ہوتا ہے۔ گھما پھرا کر ٹیڑھی ترچھی راہوں سے گزرنا انھیں پسند ہی نہیں۔ رائے بھی صائب اور بڑی حد تک نپی تلی، بات بھی گنجلک نہیں بلکہ شفافیت کے ساتھ دوٹوک اور لب و لہجہ علمی مباحث کے دوران، اظہار و بیان کے وسمساز کی طرح پُر وقار اور شائستہ، جس کی ہمیں مظہر امام جیسے صاحبِ نظر اور ذی فہم فنکار سے امید ہوتی ہے۔

البتہ علمی سطح پر مجھے مظہر امام کے تنقیدی بیانات کے بعض پہلوؤں سے جتنا اتفاق ہے اتنا ہی اختلاف کہیں کہیں ان کے دوسرے نقاطِ نظر سے ہے۔ جیسے اس کتاب کے ان کے دیباچے سے یہ اقتباس :

''وہ تنقید جو ادب سے مسرّت اور بصیرت اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے خال خال ہی دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے یہاں ادب کی تنقید کم کم ہے، البتہ تنقید کی تنقید خوب ہو رہی ہے۔

ادب فہمی سے زیادہ تنقید فہمی پر زور ہے۔خوفِ فسادِ نقد نے تخلیقی سرگرمیوں کو ماند کر دیا ہے۔

اب ملکِ ادب میں تخلیقی فنکار کی حیثیت دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شہری کی ہو گئی ہے۔تنقید کی آمریت نے تخلیق کار سے آزادی سلب کر لی ہے۔بدذوقی کو ہوا دی ہے اور قاری کو ادب بدر کر دیا ہے۔ایسے میں اگر کچھ لوگ واقعی ادب لکھ رہے ہیں تو محض اس لیے کہ یہ ان کی مجبوری ہے۔تخلیقی مجبوری اور ان ہی کے دَم سے تخلیقی ادب کا بھرم باقی ہے''۔

یہ اقتباس خود ہی ایک تنقیدی بیان ہے اور مظہر امام کے تنقیدی مزاج اور نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے اور بڑی حد تک ہمعصر تنقیدی رجحانات اور رویّوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

جہاں تک اتفاق کرنے کی بات ہے وہ یہ ہے کہ آج کے تنقیدی ادب میں واقعی وہ تنقید جو ادب سے مسرت اور بصیرت اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے، خال خال ہی دکھائی دیتی ہے،لیکن بیان کے اس حصّے سے مجھے کامل اتفاق نہیں کہ یہاں ادب کی تنقید کم ہے،البتہ تنقید کی تنقید خوب ہو رہی ہے۔یہ سچ ہے کہ ادب فہمی سے زیادہ تنقید فہمی پر زور ہے مگر ایسی مثالیں بہت زیادہ نہیں۔اس کے برخلاف اس کے برعکس رویّے بھی بکثرت ملتے ہیں۔اسی طرح میں یہ بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ خوفِ فسادِ نقد نے تخلیقی سرگرمیوں کو ماند کر دیا ہے۔ایسا پہلے بھی نہیں ہوا اور آج بھی نہیں ہو رہا ہے۔شاید آئندہ بھی ایسا نہ ہو کیوں کہ تنقیدی شعور ادب کی تخلیق کا پہلی منزل سے لے کر آخری منزل تک معاون ہے،اس کا مخالف نہیں۔کلاسیکی ادب کے فروغ میں قصائد اور ہجو کا دورِ شباب آیا مگر بعد کو نقدِ ادب کے مزاج نے انھیں پسند نہیں کیا۔خواہ کسی وجہ سے کیوں نہ ہو، یہ رویّے مفقود ہونے کی حد تک بدل گئے۔ترقی پسندی کے عروج کے زمانے میں غزل کو نشانۂ ملامت بنایا گیا مگر صحت مند تنقیدی شعور نے اس رویّے کو رد کر دیا۔پھر غزل نیم وحشی صنفِ سخن نہیں بلکہ اردو شاعری کی آبرو بن گئی اور اسی طرح جدیدیت کی ہماہمی میں '' سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا '' کو بالغ نظر تنقیدی شعور نے قبول نہیں کیا۔اس لیے اس طرح کی شاعری کم سے کم ہوتی گئی۔تجریدی افسانے کا بھی یہی حال ہوا،مگر کیا شاعری رُک گئی ، کیا افسانہ نگاری ختم ہوگئی؟ نہیں بلکہ جو غلط رویّے اور رجحانات سر اُٹھا رہے تھے وہ ختم ہو گئے۔تنقید کا کام بھی یہی ہے اور یہی اس کا منصب ہے۔

مظہر امام نے ایک جگہ لکھا ہے :

'' میں نے اپنا مضمون ' آتی جاتی لہریں ' ۱۹۶۷ء میں لکھا تھا جب جدیدیت اپنے پر پرزے نکال رہی تھی۔میں نے اس مضمون میں جدیدیت کے نام پر روا رکھے جانے والے کئی غلط رویّوں کی نشاندہی کی تھی اور بعض خطرات سے آگاہ کیا تھا جن کی صداقت جلد ہی ثابت ہو گئی ہے''۔

ادب فہمی سے زیادہ تنقید فہمی پر زور ہے۔ خوفِ فسادِ نقد نے تخلیقی سرگرمیوں کو ماند کر دیا ہے۔

اب ملکِ ادب میں تخلیقی فنکار کی حیثیت دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شہری کی ہو گئی ہے۔ تنقید کی آمریت نے تخلیق کار سے آزادی سلب کر لی ہے۔ بدذوقی کو ہوا دی ہے اور قاری کو ادب بدر کر دیا ہے۔ ایسے میں اگر کچھ لوگ واقعی ادب لکھ رہے ہیں تو محض اس لیے کہ یہ ان کی مجبوری ہے۔ تخلیقی مجبوری اور ان ہی کے دم سے تخلیقی ادب کا بھرم باقی ہے''۔

یہ اقتباس خود ہی ایک تنقیدی بیان ہے اور مظہر امام کے تنقیدی مزاج اور نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے اور بڑی حد تک ہمعصر تنقیدی رجحانات اور رویّوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

جہاں تک اتفاق کرنے کی بات ہے وہ یہ ہے کہ آج کے تنقیدی ادب میں واقعی وہ تنقید جو ادب سے مسرت اور بصیرت اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے، خال خال ہی دکھائی دیتی ہے، لیکن بیان کے اس حصے سے مجھے کامل اتفاق نہیں کہ یہاں ادب کی تنقید کم ہے، البتہ تنقید کی تنقید خوب ہو رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ادب فہمی سے زیادہ تنقید فہمی پر زور ہے مگر ایسی مثالیں بہت زیادہ نہیں۔ اس کے برخلاف اس کے برعکس رویے بھی بکثرت ملتے ہیں۔ اسی طرح میں یہ بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ خوفِ فسادِ نقد نے تخلیقی سرگرمیوں کو ماند کر دیا ہے۔ ایسا پہلے بھی نہیں ہوا اور آج بھی نہیں ہو رہا ہے۔ شاید آئندہ بھی ایسا نہ ہو کیوں کہ تنقیدی شعور ادب کی تخلیق کا پہلی منزل سے لے کر آخری منزل تک معاون ہے، اس کا مخالف نہیں۔ کلاسیکی ادب کے فروغ میں قصائد اور ہجو کا دورِ شباب آیا مگر بعد کو نقدِ ادب کے مزاج نے انھیں پسند نہیں کیا۔ خواہ کسی وجہ سے کیوں نہ ہو، یہ رویے مفقود ہونے کی حد تک بدل گئے۔ ترقی پسندی کے عروج کے زمانے میں غزل کو نشانۂ ملامت بنایا گیا مگر صحت مند تنقیدی شعور نے اس رویے کو رد کر دیا۔ پھر غزل نیم وحشی صنفِ سخن نہیں بلکہ اردو شاعری کی آبرو بن گئی اور اسی طرح جدیدیت کی ہماہمی میں ''سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا'' کو بالغ نظر تنقیدی شعور نے قبول نہیں کیا۔ اس لیے اس طرح کی شاعری کم سے کم ہوتی گئی۔ تجریدی افسانے کا بھی یہی حال ہوا، مگر کیا شاعری رُک گئی، کیا افسانہ نگاری ختم ہو گئی؟ نہیں بلکہ جو غلط رویے اور رجحانات سر اُٹھا رہے تھے وہ ختم ہو گئے۔ تنقید کا کام بھی یہی ہے اور یہی اس کا منصب ہے۔

مظہر امام نے ایک جگہ لکھا ہے:

''میں نے اپنا مضمون 'آتی جاتی لہریں' ۱۹۶۷ء میں لکھا تھا جب جدیدیت اپنے پر پرزے نکال رہی تھی۔ میں نے اس مضمون میں جدیدیت کے نام پر روا رکھے جانے والے کئی غلط رویّوں کی نشاندہی کی تھی اور بعض خطرات سے آگاہ کیا تھا جن کی صداقت جلد ہی ثابت ہو گئی ہے''۔

میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی جب کہ مظہر امام کے تنقیدی نوعیت کے مضامین کا دوسرا مجموعہ "ایک لہر آتی ہوئی" شائع ہو چکا ہے (۱۹۹۷ء)، ان کے تنقیدی نظریات انہی بنیادوں پر قائم ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اصابتِ فکر اور اعتدالِ مزاج سے ہی تعمیری ادب تخلیق ہوتا ہے۔

مظہر امام کا یہ خیال بھی درست ہے کہ :

> "زندگی، نظریۂ زندگی سے زیادہ اہم ہے۔ ادیب کے لیے کسی مخصوص نظریۂ حیات یا فلسفہ یا عقیدہ یا مسلک سے کلی طور پر وابستہ ہونا ضروری نہیں۔ ادب کا تعلق انسان اور حیاتِ انسانی سے ہے اور کوئی بھی ادب غیر انسانی اور رجعت پسند نہیں ہوتا۔ انسانی دوستی، مساوات، عالمگیر برادری، حسن و خیر اور صداقت کے تصورات تخلیقی سرگرمیوں کے خاص محرک ہیں"۔

یہ بات تخلیقی اور تنقیدی دونوں اعتبار سے صحیح ہے۔ دراصل تنقید کا مدعا بھی یہی ہے اور منشا بھی یہی۔

OOO

فہرست

مشورت ادراک و ہشیاری دہد — عقلہا را عقلہا یاری دہد (مولانا روم)
حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے — عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے (اقبال)

(۴)

مجلس مشاورت

ڈاکٹر مختارالدین احمد — ڈاکٹر عارف نوشاہی
پروفیسر نادم بلخی — ڈاکٹر ظفر کمالی
ڈاکٹر ارشاد حسن معصومی — ڈاکٹر ولی احمد ولی

معاونین

محمودالحسن — فہیم جوگاپوری
امانت حسین — ارشاد احمد
فاروق سیوانی — چن شرما شرر سیوانی
سید محمد نعیم

مدیر (اعزازی)

سید حسن عباس

ترسیل زر کا پتا

ڈاکٹر نذر عباس
گوپال پور، باقر گنج، سیوان
بہار - ۸۴۱۲۸۶ (ھند)
فون نمبر۔ ۰۶۱۵۴-۲۷۲۳۳۱

زرسالانہ	۱۰۰ روپے
لائبریریوں سے	۲۰۰ روپے
اس شمارے کی قیمت	۵۰ روپے
بیرون ممالک فی شمارہ	۵ ڈالر
سالانہ	۱۲ ڈالر

مقالہ نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی سیوان کی عدالت میں ممکن ہے۔

زیر اہتمام: مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور۔ باقر گنج، سیوان۔ بہار (ھند)

کمپوزنگ: کمپیوز گیلکسی، بجیتان نو پہ مارکیٹ کے سامنے، برہامندر روڈ، پٹنہ۔۶، موبائل نمبر 0612-3337368

پرنٹر، پبلشر، اڈیٹر سید حسن عباس نے [illegible] چھپوا کر دفتر ادراک گوپال پور۔ باقر گنج، سیوان (بہار) سے شائع کیا۔

ادراک
گوپالپور
مدیر اعزازی
ڈاکٹر سید حسن عباس